

سیرتِ رسولؐ اور حُسنِ اعتدال

ڈاکٹر سید عزیز الرحمن^o

انسانی زندگی، عناصر کے اعتدال کا نام ہے۔ خود نظامِ عالم اسی اعتدال پر قائم ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام تکوینی امور میں توازن و اعتدال سے مکمل کارفرما نظر آتی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے خاص اسلوب میں مثالیں دے کر اور انداز بدل بدل کر اس جانب بار بار متوجہ کیا ہے۔ ایک مقام پر تو بہت واضح الفاظ میں فرمایا:

تم رحمن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ (الملک

۶۷: ۳-۴)

اسلام یہی حکم عملی زندگی کی تمام تشریحی ہدایات میں بھی عطا فرماتا ہے۔ اسلام اعتدال اور میانہ روی کو زندگی کا حسن قرار دیتا ہے، تاکہ انسانی اعمال اسی اعتدال سے مزین ہو کر معاشرے کی تعمیر اور آخرت کی کامیابی کے موجب بنیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حسنِ اعتدال کی وضاحت اپنے احوال اور اپنے افعال سے فرمائی ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ تین حضرات ازواجِ مطہرات[ؓ] کے پاس آئے اور آپ کے معمولاتِ عبادت کے بارے میں معلوم کیا۔ جب اس کی تفصیلات ان کے سامنے رکھی گئیں تو انہوں نے اسے کم جانا اور کہا کہ کہاں، ہم اور کہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا: ”میں تو رات بھر نماز میں مصروف رہا کروں گا“۔

o نائب مدیر 'السییرہ عالمی' کراچی

دوسرے نے کہا: ”میں تمام عمر روزے سے رہوں گا، اور کبھی روزہ ترک نہیں کروں گا“، اور تیسرا شخص بولا: ”میں کبھی شادی نہیں کروں گا“۔ یہ سب آپ کے علم میں آیا تو آپ نے ان تینوں صحابہ کے بارے میں فرمایا:

لوگوں کو کیا ہو گیا کہ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، روزے کا ناغہ بھی کرتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔ (مسلم، ج ۲، ص ۳۲۸، رقم: ۱۴۰۱)

اس واقعے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طریقے اور سنت کی وضاحت بھی فرمائی ہے، اور راہ اعتدال کی عملی تشریح بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں جاہلۃ اعتدال سے بٹنے والوں کو تنبیہ بھی فرمائی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس بارے میں اس قدر سختی فرمائی ہے: ”اپنے افعال اور اقوال میں حد سے تجاوز کرنے والے ہلاک ہو گئے“۔ (مسلم، ج ۴، رقم: ۲۶۷۰)

انسانی زندگی دو حوالوں سے عبارت ہے: ایک اس کا جسمانی وجود، اور دوسری اس کی روحانی قوت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی راہ نمائی ان دونوں حوالوں سے فرمائی ہے، اور حیات انسانی کے ان دونوں شعبوں میں ایسی تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی روحانی تربیت بھی کر سکتا ہے، اور جسمانی و بدنی تنظیم بھی۔ اس تربیت کے لیے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسے آداب تلقین فرمائے گئے ہیں، جو اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کمانے کھانے اور رہن سہن کے ہر پہلو سے متعلق مکمل احاطہ فرماتے ہیں۔ ان تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ جب انسان مزاج کے اعتبار سے اعتدال پر قائم ہو جاتا ہے، پھر نہ تو وہ رہبانیت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے اور نہ خالص مادیت اس کی انسانی تنگ و دو کا حاصل اور مقصد حیات ٹھہرتی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم روزِ محشر کفار کی پشیمانی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

کافر بار بار تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے کہ وہ (خوب) کھالیں اور فائدہ اٹھالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں۔ بہت جلد ان کو (حقیقت) معلوم ہو جائے گی۔ (الحجر ۱۵: ۲، ۳)

اسلام کی تعلیمات تو اس قدر واضح ہیں کہ اس مسئلے پر دنیا کا کوئی نظام اور مذہب ایسی دو ٹوک ہدایات اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ قرآن کریم میں ہے:

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر حاصل کر اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر، اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ بن۔ یقیناً اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ (القصص ۲۸: ۷۷)

زندو بننے کے لیے کھانے کا اصول

قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرماتا ہے:

اور جو کافر ہیں وہ (دنیا میں کچھ) فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اس طرح کھاتے ہیں جس

طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ہی ان کا ٹھکانا ہے۔ (محمد ۱۲: ۲۷)

اسلام نے کھانے پینے میں خاص طور پر احتیاط کی تعلیم دی ہے اور خوردن برائے زیستن (زندہ رہنے کے لیے کھانا) کا اصول عطا فرمایا ہے۔ کھانا پینا انسانی ضرورت ہے، لیکن ضرورت کو مقصد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اور اگر یہ غلطی کر لی جائے تو پھر انسان کا حیوانیت کے درجے سے بلند ہونا ممکن نہیں رہتا: ”اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے“۔ (البقرہ ۲: ۱۵۵)

اس بنا پر رزق میں کمی، کاروباری نقصان، ملازمت میں ترقی کا نہ ہونا، بیماریاں، اپنے پیاروں کا اٹھ جانا سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے ہے، اور محض آزمائش ہے۔ یہ نہ سزا ہے، نہ پکڑ ہے، نہ ہمارے اچھے ہونے کی علامت ہے، نہ برے ہونے کی۔ ہمارے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ تو اس آزمائش کے بعد ہوگا۔ یہ تو دنیا میں آنے والے ہر شخص کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے انعام کے وقت شکر اور کسی مشکل کے وقت صبر ہی انسان کو کامیاب بناتا ہے، اور آخری زندگی میں سرخ رو کرتا ہے۔ (سید عزیز الرحمن: قرآن کیلئے ہتھیار، کراچی، زوارا کیڈمی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے کھانے پینے میں احتیاط کی بھی تعلیم دی ہے اور ’زیستن برائے خوردن‘ کے رویے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک روایت میں آپؐ نے فرمایا: ”جو لوگ دنیا میں سب سے زیادہ شکم سیر ہیں، روزِ آخرت وہی سب سے زیادہ بھوکے ہوں گے“۔ (بزار)

اس طرح اب یہ بات پوری طرح پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کثرتِ طعام انسان کے لذت کام و دہن کا بہانہ تو ہے، عملی طور پر چوں کہ یہ غیر فطری ہے، اسی لیے انسانی صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ اسی تناظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دیکھیے:

انسان کو تو اتنا کھانا کافی ہے، جو اس کی پشت کو سیدھا رکھ سکے۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ کھانا ہی چاہتا ہے تو پیٹ کا ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پینے کے لیے اور ایک حصہ سانس لینے کے لیے (خالی) رکھے۔ (ابن ماجہ، ج ۴، رقم: ۳۳۴۹)

گویا یہ ایسا برتن ہے، جس کا بھرنا اچھی علامت نہیں۔ اس بات کی وضاحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور واقعے میں تمثیلی انداز میں بھی فرمائی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک کافر ایک بار رسول اکرمؐ کا مہمان ہوا تو آپؐ نے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا۔ دودھ نکالا گیا تو مہمان اسے پی گیا۔ پھر دوسری بکری لائی گئی اور اس کا بھی دودھ کافر مہمان پی گیا، پھر بھی اسے شکم سیری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ اکیلے اس کی خوراک بن گیا۔ صبح کو وہ مسلمان ہو گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دودھ دوہنے کا حکم دیا، چنانچہ ایک بکری کا دودھ تو وہ شخص پی گیا لیکن دوسری بکری کا دودھ ختم نہ کر سکا۔ اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مومن ایک معدے میں نوش کرتا ہے، جب کہ کافر سات معدوں میں پیتا ہے۔ (مسلم، ج ۳، رقم: ۲۰۶۱)

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ کی ایک اور روایت میں فرمایا:

اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور طلب (رزق) میں اعتدال سے کام لو۔ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنا رزق پورا پورا وصول نہ کر لے، اور اگر کبھی رزق کے حصول میں دیر ہو جائے تو بھی اللہ سے ڈرو۔ کوشش میں اعتدال سے کام لو، جو رزق حلال ہو اسے لے لو اور جو حرام ہو اسے چھوڑ دو۔ (ابن ماجہ، ج ۳، رقم: ۲۱۴۴)

یعنی طلبِ رزق حلال عبادت ہے، مگر ضرورت کی حد تک۔ اگر اسے مقصد حیات بنا لیا جائے، اور زندہ رہنے کا واحد جواز کمانے اور ہر طرح کمانے میں تلاش کیا جائے تو یہ عمل انسان کو جادہٴ اعتدال سے ہٹانے کا باعث بن سکتا ہے۔

اس لیے اسلام دونوں جانب سے اعتدال کی تلقین کرتا ہے، ایک طرف تو وہ کہتا ہے:
 رزق حلال میں لگنا اور اس کی تنگ و دو کرنا یہ (نماز، روزہ، حج جیسے) فرائض کے
 بعد ایک فریضہ ہے۔ (طبرانی، ج ۱۰، ص ۷۴)

اگر یہ فرض ادا نہیں ہوگا تو اتنا ہی گناہ ہوگا، جتنا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ چھوڑنے کا گناہ ہوگا۔ کیوں؟
 اس لیے کہ انسان کی ضرورتیں انسان کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اس کے ساتھ منسلک کر دی گئی ہیں
 کہ ان کو بہ ہر صورت پورا کرنا ہے۔ اگر آپ ان ضرورتوں کی تکمیل حلال طریقے سے نہیں کریں
 گے تو حرام طریقے سے کریں گے، لیکن حرام طریقے سے کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، تو یقیناً
 پھر ہمیں حلال طریقے کی طرف جانا چاہیے۔ جب حلال طریقے کی طرف جانا ہمارے لیے لازمی ہے
 تو یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کی جائے گی تو اس میں ہمیں ان شاء اللہ
 ثواب ملے گا (قرآن کیکہ بتلے؟، ص ۲۴-۲۵)۔ دوسری جانب اسلام کمانے میں اعتدال کی
 تلقین فرماتا ہے، جس کی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔

اس کائنات میں ایسے نظریات اور خیالات بھی موجود ہیں، جو فطرت کے خلاف عمل ہی کو
 کام یابی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ یہ جسم کے مطالبات کو کچل کر راحت تلاش کرتے ہیں اور روح کو
 جسم کے مقابل رکھ کر سوچتے ہیں۔ یہی وہ رخنہ ہے، جس سے 'رہبانیت' انسانی زندگی میں داخل
 ہوتی ہے۔ اسلام سے اس تصور کا دور کا بھی علاقہ نہیں۔

'رہبانیت' انسانی فطرت سے بے اعتنائی اور اس سے جنگ کا نام ہے۔ جو صلاحیت
 اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کا حصہ بنا دی ہے، اس سے لڑنا کیسے مفید ہو سکتا ہے؟ اسی لیے اسلام
 انسانی فطرت سے لڑنے کے بجائے اس کا حق ادا کرنے اور اس راستے میں اعتدال سے کام لینے
 کی تلقین کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ رہبانیت عیسائیت کی اپنی اختیار کردہ راہ ہے، فرمایا:
 اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کی تھی، ہم نے ان پر واجب نہیں کی تھی، لیکن انھوں
 نے رضائے الہی کے لیے اس کو اختیار کیا تھا۔ سو، انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔
 پھر بھی ہم نے ان میں سے ایمان داروں کو ان کا اجر دیا اور ان میں سے اکثر نافرمان
 ہیں۔ (الحديد ۵۷: ۲۷)

’رہبانیت‘ نے برائیوں کے سوا معاشرے کو کچھ نہیں دیا۔ دونوں مقام پر نامکمل انسان انسانی فطرت سے جنگ کرتے اور معاشرے کو برائیوں میں مبتلا کرتے نظر آتے ہیں۔ (ایضاً، ص ۲۶) اسراف و تبذیر

کمانے کے بعد خرچ کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ہر مذہب، مسلک اور نظام میں کمانے کے کچھ نہ کچھ آداب مقرر ہیں۔ اپنے آپ کو آسمانی ہدایت سے یکسر آزاد قرار دینے والے معاشرے بھی اس سلسلے میں ایک ریاستی نظام پر یقین ضرور رکھتے ہیں، اور اسی کے دائرے میں رہتے ہوئے دولت کمانے اور مادیت کی تگ و دو میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ تاہم، کمانے کے بعد خرچ کیسے کیا جائے؟ اس بارے میں اسلام کے علاوہ تمام مذاہب اور تمام نظام ہائے حیات خاموش ہیں۔

اسلام نے اس حوالے سے مکمل وضاحت کے ساتھ ایک نظام قائم کیا ہے، جس کی بنیاد ان دو اصطلاحات پر ہے: اسراف اور تبذیر۔

● اسراف: ’اسراف‘ کی تعریف راغب اصفہانی اس طرح کرتے ہیں:

السَّرْفُ تَجَاوُزُ الْحَدِّ فِي كُلِّ فِعْلٍ يَفْعَلُهُ الْإِنْسَانُ (المفردات، ص ۲۳) لغت

میں ہر انسانی فعل میں حد سے تجاوز کرنے کو اسراف کہتے ہیں۔

اور سفیان بن عیینہ اسراف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اللہ کی اطاعت کے کاموں کے علاوہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ اسراف ہے، خواہ وہ

تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ (موسو عن نضر النعمیم، ص ۳۸۸۴)

اسی طرح مناوی سے اسراف کی اصطلاحی تعریف اس طرح منقول ہے: الْإِسْرَافُ

هُوَ الْإِبْعَادُ فِي مُجَاوَزَةِ الْحَدِّ (نصرة النعمیم، ص ۳۸۸۵) ’اسراف حد سے تجاوز کرنے کو

کہتے ہیں‘۔

جرجانی نے اسراف کی یہ تعریف کی ہے: هُوَ أَنْ يَأْكُلَ الرَّجُلُ مَالًا يَجِلُّ لَهُ أَوْ يَأْكُلُ

مِمَّا يَجِلُّ لَهُ فَوْقَ الْإِعْتِدَالِ وَمَقْدَارِ الْحَاجَةِ (ایضاً) ’اسراف یہ ہے کہ انسان وہ کچھ

کھائے جو اس کے لیے حلال نہیں، یا حلال تو ہے مگر وہ اعتدال اور ضرورت سے زیادہ کھائے‘۔

● تبذیر: اس سلسلے کی دوسری اصطلاح ’تبذیر‘ ہے۔ ’تبذیر‘ لغت میں کسی چیز کو پھینکنے

اور منتشر کرنے کو کہتے ہیں۔ (نضرة النعیم، ص ۱۱۳)

’تبذیر‘ کی اصطلاحی تعریف امام شافعی سے اس طرح منقول ہے: التَّبْذِيرُ انْفَاقُ الْمَالِ فِي غَيْرِ حَقِّهِ، وَلَا تَبْذِيرٌ فِي عَمَلِ الْغَيْرِ (تفسیر قرطبی، ج ۱، ص ۲۷) تبذیر ناجائز کام میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ نیک کام میں تبذیر نہیں ہوتی۔

قرطبی کہتے ہیں: هُوَ التَّفَقُّهُ فِي غَيْرِ وُجُوهِ الدَّيْرِ الَّتِي يَتَقَرَّبُ بِهَا إِلَى اللَّهِ تَعَالَى (نضرة النعیم، ص ۱۱۴) ’’تبذیر سے مراد نیک کاموں کے سوا کسی ایسے کام میں خرچ کرنا ہے جس سے مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا نہ ہو‘‘۔

مجاہد کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنا سارا مال حق کے راستے میں خرچ کر دے تو یہ تبذیر نہیں اور اگر وہ گناہ کے کام میں ایک مد، یعنی ایک سیرغلہ بھی خرچ کرے تو یہ تبذیر ہے۔ (صفوة التفسیر، ج ۲، ص ۱۳۹)

قتادہ کہتے ہیں کہ تبذیر اللہ کی نافرمانی اور ناحق اور فساد کے لیے خرچ کرنے کا نام ہے۔ (ایضاً)

اسراف و تبذیر میں باہمی فرق واضح کرتے ہوئے کفوی کہتے ہیں:

اسراف تو کسی جائز کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں اور تبذیر ناجائز کام میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ (نضرة النعیم، ص ۱۱۴)

اسراف کی وضاحت کے حوالے سے ایک نہایت اہم روایت ذخیرہ حدیث میں ہمیں اور ملتی ہے۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ’’میں محتاج ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میں ایک یتیم کا سرپرست ہوں‘‘۔ آپ نے فرمایا:

كُلُّ مَالٍ يَتِيْمِكَ غَيْرَ مُسْرِفٍ وَلَا مُبَادِرٍ وَلَا مُتَأْتِلٍ (ابوداؤد، ج ۳، ص ۳۶، رقم: ۲۸۷۲) اپنے یتیم کے مال میں سے کھا، اسراف اور فضول خرچی اور اس کے مال سے پونجی بنائے بغیر۔

یہاں سبق آموز بات یہ ہے کہ یتیم کی کفالت جہاں اسلام میں ایک نہایت اہم فریضہ اور

باعث اجر کام ہے، وہیں اس سلسلے میں بھی فضول خرچی، یعنی اسراف سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔
گویا اعتدال اور توازن کا دامن ہر صورت میں تھا مناظروری ہے۔

سادگی اور معاشرتی وحدت

آپؐ کی ذات بابرکات نے اس سلسلے میں بھی اپنی امت کے لیے بہترین نمونہ عمل چھوڑا ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ سادہ زندگی بسر کی اور فقر وفاقے کی حالت میں نہایت صبر و شکر سے اپنے فرائض منصبی ادا کیے، باوجود اس کے کہ آپؐ کو تمام سہولتیں میسر آسکتی تھیں۔ یوں آپؐ کا فقر اختیار تھا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ يَبْدِيكَ اللَّيَالِي الْمُمْتَنَّةَ بِعَةِ طَاوِيًا وَأَهْلُهُ لَا يَجِدُونَ عَشَاءً
وَكَانَ أَكْثَرُ حُبِّهِمْ حُبَّ الشَّعْبِيِّ (ترمذی ج ۴، رقم: ۲۳۶۷) رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اور آپؐ کے گھر والے کئی کئی رات خالی پیٹ سوتے تھے، گھر میں رات کو
کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اور ان لوگوں کی خوراک اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے
قیام کے دوران وفات تک کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (الشفاء، ج ۱، ص ۸۲)
اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا گیا، کیوں کہ آپؐ کا دوسرا
جوڑا ہوتا ہی نہ تھا جو تہہ کر کے رکھا جاتا۔ (ایضاً)

آپؐ نے معاشرتی اونچ نیچ ختم کرنے پر بھی زور دیا ہے، اور مساوات و اعتدال کا درس
دیا ہے۔ جاہ و مال کی غیر ضروری نمائش کا واحد مقصد اپنی برتری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قسم کی منفی
سوچ معاشرے کی وحدت اور اجتماعیت کو ختم کر کے اتحاد و اتفاق پر منفی معاشرے کی تباہی کا سبب
بن جاتی ہے۔ اس لیے آپؐ نے آرائش پر تو پابندی عائد نہیں کی، لیکن نمائش کو قطعاً ممنوع قرار دیا
ہے تاکہ معاشرتی وقار نمائش پسندوں کا شکار نہ ہو سکے۔ چنانچہ عبادت و ریاضت، کھانے پینے،
سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے اور رہنے سہنے سے لے کر لباس و مکان تک ہر مقام پر
آپؐ کے ارشادات اعتدال کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ اگر ہر معاملے میں اعتدال و میانہ روی
کو اختیار کر لیا جائے تو معاشرتی وحدت اور مساوات خود بہ خود قائم ہو سکتی ہے۔

انسان نمائش کی ابتدا عموماً اپنے لباس سے کرتا ہے۔ آپؐ نے اس بارے میں اعتدال پر مبنی ہدایات فرمائیں۔ آپؐ نے جہاں ایک طرف غرباً و فقراً کو ان کے لباس سے قطع نظر ان کے باطنی حالات کے پیش نظر قبولیت کی سند عطا فرمائی، وہیں مال دار افراد کو بھی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حکم دیا، تاکہ افراط و تفریط کے مابین توازن قائم ہو سکے اور اعتدال کا قیام عمل میں آسکے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ”کتنے ہی پر اگندہ حال چیتھڑوں میں ملبوس انسان ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتے ہیں“۔ (ترمذی، ج ۵، رقم: ۳۸۸۰)

آپؐ نے خود کس حالت میں زندگی بسر کی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گواہی ملاحظہ ہو۔ حضرت ابو درد اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوندگی ہوئی چادر اور ایک یمن کی بنی ہوئی لنگی پیش کی، اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اللہ کے رسولؐ نے انھی دو کپڑوں میں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی تھی۔ (بخاری، ج ۴، ص ۲۱۔ ابن ماجہ، ج ۴، ص ۴۸، رقم: ۳۵۵۰)

دوسری جانب آپؐ نے مال دار افراد کو تلقین کی: ”اگر کوئی شخص خوش حال ہے تو کیا حرج ہے کہ اگر وہ کام کاج کے دو کپڑوں کے علاوہ جمعہ کے دن کے لیے بھی دو کپڑے رکھے“۔ (ابوداؤد، ج ۴، رقم: ۱۰۷۸)

اسی طرح ایک شخص کو میلے کچلے لباس میں دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے۔ (ابوداؤد، ج ۴، رقم: ۴۰۶۲)

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بدن پر بھٹا پرانا لباس تھا۔ آپؐ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: کس قسم کا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے ہر قسم کے مال سے نواز رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”جب اللہ نے تجھے مال دے رکھا ہے تو اللہ کی نعمت اور سخاوت کا اثر بھی ظاہر کر“۔ (ابوداؤد، ج ۴، رقم: ۴۰۶۳)

تاہم، اسلام نے خوش پوشاکی کی حد سے گزر کر اسراف کی حدود میں داخل ہو جانے والی آرائش کی سختی سے ممانعت کی ہے جو دراصل نمائش اور دکھلاوے کی خاطر کی جاتی ہے، کیوں کہ یہ راہِ اعتدال سے ہٹ کر ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: ”جس نے دنیا میں شہرت کا لباس زیب تن کیا

اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا اور اس میں آگ بھڑکائے گا۔ (ابن ماجہ، رقم: ۳۶۰۷)

زیورات خواتین کی فطری خواہش ہے۔ آپؐ نے اس فطری تقاضے پر پابندی عائد نہیں کی، البتہ افراط سے وہاں بھی منع فرمایا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بہن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے عورتو! کیا زیور بنانے کے لیے تمہارے لیے چاندی کافی نہیں ہے؟ خبردار! جو عورت بھی سونے کا زیور بنائے گی اور اس کے ذریعے زینت کا اظہار کرے گی اسے اسی زیور سے عذاب دیا جائے گا۔“ (ابوداؤد، ج ۴، رقم: ۴۲۳۷)

یہ وعید ان عورتوں کے لیے ہے جو زیورات کی دیوانی ہوتی ہیں اور جو رنگ و نُور کے سیلاب میں کھو کر فرائض اور حقوق سے غافل ہو جاتی ہیں۔

مال دار حضرات کا سب سے زیادہ زور تعمیرات میں صرف ہوتا ہے، اور اس موقع پر عموماً حد اعتدال کو برقرار نہیں رکھا جاتا۔ اس کا ایک مقصد نمائش کے علاوہ عیش کوشی اور آرام طلبی ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی جانب گورنر بنا کر روانہ فرمایا تو یہ نصیحت بھی کی: ”عیش کوشی سے دور رہنا، کیونکہ اللہ کے بندے آرام طلب نہیں ہوتے۔“ (احمد، ج ۵، ص ۲۴۴)

یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا حرام فرمادیا اور مردوں کے لیے حریوریشم کے استعمال کو ممنوع قرار دیا۔

اس پوری بحث کو ایک حدیث میں یوں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”میری امت میں ایسے لوگ آئیں گے جو رنگ رنگ کے کھانے کھائیں گے، انواع واقسام کے مشروبات استعمال کریں گے، اور طرح طرح کے لباس زیب تن کریں گے، اور منہ پھاڑ پھاڑ کر باتیں بنائیں گے۔ یہی لوگ میری امت کے بدترین افراد ہوں گے۔“ (المعجم الکبیر، ج ۱، ص ۱۰۷)

خود آپؐ نے عملی طور پر اسلامی حکومت کے قیام کے بعد مساوات کا وہ عظیم الشان نمونہ پیش فرمایا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے آج بھی قاصر ہے۔ آپؐ کے اور صحابہ کرامؓ کے مابین لباس کے اعتبار سے بھی کوئی فرق نہ تھا۔ اسی طرح آپؐ کی نشست بھی ایسی عام اور کسی امتیاز کے

بغیر ہوتی تھی کہ باہر سے آنے والے شخص کو آپ کے بارے میں پوچھنا پڑتا تھا۔ صحابہ کرام نے آپ کے بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ بنانا چاہا تو آپ نے اس کو بھی پسند نہ فرمایا۔ (سید عزیز الرحمن، تعلیمات نبوی اور آج کے زندہ مسائل، القلم، فرحان ٹیرس، کراچی، مئی ۲۰۰۵ء)

دین میں بے اعتدالی

اعتدال اور توازن کا حکم صرف کھانے پینے، کمانے اور معاشرتی امور تک محدود نہیں ہے۔ یہ حکم انسانی زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ دین کے معاملے میں بھی غلو سے بچنے کا حکم بہ راہ راست قرآن کریم میں دیا گیا، اور یہاں غلو سے مراد بھی حد سے بڑھنا ہے۔ دین کے معاملے میں غلو اور حدود سے تجاوز کرنا سخت ناپسندیدہ ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (النساء ۴: ۱۷۱) ”تم اپنے دین کے معاملے میں غلو نہ کرو“۔

اس غلو کا نتیجہ بھی شدت پسندی کی صورت میں نکلتا ہے، اور جو لوگ غلو سے دوچار ہو جاتے ہیں وہ پھر اعتدال سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے اس سے بھی منع فرمایا: ”تم دین میں غلو سے بچو، کیوں کہ، پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں“۔ (ابوداؤد، ج ۴، رقم: ۴۹۰۴) اسی طرح شدت پسندی بھی عدم توازن کی علامت ہے۔ اعتدال اور توازن پر کار بند شخص کسی حوالے سے شدت پسند نہیں ہو سکتا۔ قرآن و سنت کی پوری تعلیمات اور اسوہ حسنہ کا پیغام اسی کے گرد گھومتا ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے دین کے معاملے میں بھی اس سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ تمہارے اوپر سختی کی جائے گی، کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی، پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ ان ہی لوگوں کے باقیات ہیں جو گرجوں اور خانقاہوں میں نظر آتی ہیں۔ (ابوداؤد، ج ۴، رقم: ۴۹۰۴)

یہ حقیقت ہے کہ حسن اعتدال اور توازن ہی حیات انسانی کا حسن ہے، اور اسی کے ذریعے ہماری دنیاوی زندگی کامیابی سے بسر ہو سکتی ہے، جس پر ہماری اخروی دائمی زندگی کا مدار اور انحصار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اور اس پر عمل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین!